(غلام گردش)

ہجوم

معیاری موسیقی کمال کی چیز ہے۔آسودگی اور شادابی کا احساس دینے والا جادو۔اسکا اثر اس قدر توانا ہے کہ اگر آپ تھوڑی دیر غم زدہ نغمے سنتے رہیں تو واقعی بذاتِ خود غمزدہ ہو جائینگے۔ ہر ذی شعور پر لے، گیت اور ساز کا علیحدہ علیحدہ اثر ہوتا ہے۔موسیقی ایک ایسی دوائی ہے جو ہر مریض پر الگ الگ تاثیر رکھتی ہے۔مسئلہ یہاں ایک اور بھی ہے۔اچھے گانے والے گائک انتہائی کم یاب ہیں اور ہمارے ناپختہ دور میں تو معیاری گلوکار از حد کم ہیں۔اسکی وجہ دراصل کیا ہے۔بالکل سمجھ نہیں آتا۔شائد ہمارا خطہ بنجر سے بنجر ترین ہوتا جا رہا ہے۔طویل وقفہ کے بعد بھی کوئی باوصف انسان پیدا نہیں ہوتا۔

تھوڑی دیر کیلئے سنگیت کی دنیا کو بھول جایئے۔کسی بھی شعبہ میں بڑے لوگ نظر نہیں آتے۔تقسیمِ برصغیر کے وقت سیاستدان کیا تھے۔دیومالائی کردار۔مگر اب کیا ہے۔مقابلہ کرتے ہوئے بھی معیوب سا لگتا ہے۔علماء دین کی طرف دیکھیے۔ستر اسی برس پہلے کس قدر جید علماء موجود تھے اور آج وہی دو چار دین کی فہم رکھنے والے قابل لوگ۔کسی بھی شعبہ کو کنگھال لیجئے۔آٹھ نو دہائیوں سے ہر چیز روبہِ زوال ہے۔دو سال پہلے، میں نے لکھا تھا کہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے کی نسل میں جو بلند قامت لوگ تھے،اب وہ ہمارے سماج میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔عام دلیل دی جاتی ہے کہ بڑی ترقی ہوئی ہے۔درست ہے کہ زندگی کی رفتار قدرے تیز ہوگئی۔سہولتیں بھی بہتر ہوگئیں۔مگر جہاں تک جوہر قابل کی بات ہے۔یعنی ان لوگوں کی جنہوں نے اپنے اپنے شعبوں میں لازوال عروج حاصل کیا ہو تو صورتحال انتہائی مایوس کن ہے۔تمام تر ضروریات پوری ہونے کے باوجود بھی سامنے آنے والے لوگ کسی بھی لحاظ سے قابل ذکر نہیں۔مگر دوسری طرف سوچنے کی ایک اور بات ہے کہ کیا وجہ تھی کہ ہر شعبہ کے بڑے لوگ صرف اور صرف نصف صدی سے پہلے بلکہ پاکستان بننے سے پہلے پیدا ہونے والی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔آخر کیوں۔حالانکہ اس وقت تو کسی قسم کی جائز سہولت تک موجود نہیں تھی۔تعلیم نہیں تھی۔گاڑیاں نہیں تھیں۔اکثر جگہ پر بجلی نہیں تھی۔کمپیوٹر نہیں تھا۔موبائل فون نہیں تھا۔پھر بھی پُر تاثیر لوگ کام کرتے رہے اور اپنے نام کا سکہ چھوڑ گئے۔شائد مصائب اور تکالیف میں انسان کے سوچنے کا انداز اور ہوتا ہے اور آرام دہ ماحول میں کچھ اور۔تعلیمی شعبہ میں دوسرا سرسید پیدا نہیں ہوسکا۔صحافت میں حسرت موہانی،ظفر علی خان جیسے جفادری لوگ دوبارہ سامنے نہیں آئے۔محمد علی جناح، گاندھی اور جواہر لال نہرو جیسے سیاستدان بھی دور دور تک نظر نہیں آتے۔

موسیقی کے شعبہ کو سامنے رکھیے۔کیونکہ بات بہرحال موسیقی سے شروع ہوئی تھی۔کندن لال، سہگل، بیگم اختر فیض آبادی، بڑے غلام علی خان، روشن آراء بیگم اور امانت علی خان جیسے سریلے لوگ اب کیوں پیدا نہیں ہوتے۔یہ وہ چند لوگ ہیں جنکا کوئی ثانی نہیں ہے۔المیہ ایک اور بھی ہے کہ اچھی موسیقی کا شعور رکھنے والے لوگ بھی بہت کم یاب ہیں۔سہگل جیسی المناک آواز دوبارہ پیدا نہیں ہو پائی۔تجربہ کر کے دیکھیے۔کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی سے پوچھ لیجئے کہ بھئی یہ کے ایل سہگل کون ہے۔ننانوے فیصد لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔ایک اور نکتہ بھی ہے۔اگر آپ اس عظیم گلوکار کا گانا سن رہے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ساتھ والے

اُکتا جائیں۔انکی دانست میں تو یہ بے حد قدیم میوزک ہے جسکا سننا بیکار ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ " کھرج" کی آواز میں اس سطح پر گانے والا پورے برصغیر میں سہگل کے بعد کوئی دوسرا نہیں۔آج بھی سہگل کی جادوئی آواز انسان کے دل میں گداز پیدا کر دیتی ہے۔سننے والوں کی کمیابی کا ذکر چھوڑیے۔لاہور جیسے بڑے شہر میں صرف ایک یا دو دکانیں ہیں جو اس عظیم گلوکار کی سی ڈیز بناتے ہیں۔مکمل کام پورے لاہور میں کسی بھی جگہ دستیاب نہیں ہے۔سہگل کے پنجابی اور بنگالی گانے کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔ہوسکتا ہے کہ کسی شوقین مزاج کی ذاتی کوشش سے یہ اسکے پاس موجود ہوں مگر عام بلکہ خاص دکانوں پر بھی سہگل کے مکمل گانے موجود نہیں۔غور سے دیکھا جائے تو کسی بھی پرانے گلوکار یا گلوکارہ کا پورا کام یہاں محفوظ نہیں رکھا گیا۔وجہ یہ ہم ایک سطحی معاشرے میں رہ رہے ہیں۔لہذا یہاں سنجیدگی سے کام کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔اب خیال ہے کہ شائد ہمارے نظام میں سنجیدگی کی ضرورت ہے ہی نہیں۔ہونی بھی نہیں چاہیے۔شائد یہ ہمیں قدرت کی جانب سے سزا ہے کہ ہم تمام لوگ سطحیت کے قیدی بن کر رہ چکے ہیں۔

چلیے۔کندن لال سہگل تو تقسیم سے پہلے ہی دنیا سے چلا گیا۔مگر بیگم اختر کے متعلق یہاں کون جانتا ہے۔غضب کی آواز۔اس خاتون نے چار سو سے زیادہ غزلیں، ٹھمریاں اور گانے گائے۔اسکی آواز ہزاروں کے مجمع کو مسحور کر دیتی تھی۔اپنے فن میں یکتا، اس گائکہ نے غزل گوئی کا وہ بلند معیار قائم کیا جو بعد میں آنے والوں کیلیئے ناقابل تسخیر ہوگیا۔شائد اس معیار کو حاصل کرنا ناممکن ہے۔اس خاتون کی حساسیت دیکھیے۔اپنی آخری محفل میں بیگم اختر کو آواز اپنے گزشتہ معیار سے پست لگی۔یہ محفل "بلاراما پورم" میں منعقد ہوئی تھی۔کسی بھی سننے والے نے کوئی منفی بات نہیں کی۔سب تعریف کرتے رہے۔مگر بیگم اختر نے جو محسوس کیا تھا۔اسے اپنے اوپر اس قدر طاری کرلیا کہ سخت بیمار ہوگئی اور اسے ہسپتال لیجانا پڑا۔خود احتسابی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی۔کیا ہمارے پاس موجودہ دور میں ایک بھی شخص اس درجہ خود احتسابی کرتے ہوئے نظر نہیں آئیگا۔توقع بھی نہیں کرنی چاہیے۔اسلیے کہ اب وہ لوگ گاتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انہیں گانا آتا ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ ننانوے فیصد فنکار شعبہ موسیقی کی الف ب نہیں جانتے۔پر گلہ کیسا اور پھر کس سے کریں۔

قوالی کی صنف کی ہی مثال لیجئے۔غلام فرید صابری جیسے بلند پایہ قوالوں نے آج سے چالیس پچاس برس پہلے اس عظیم سطح کی قوالیاں گائیں کہ کوئی ثانی نہیں ہے۔انکے کلام کے انتخاب کو پرکھیے۔مولانا روم اور امیر خسرو جیسے برگزیدہ شخصیات کے اشعار کو استعمال کرتے رہے۔یہ بذات خود ایک دلیل ہے کہ صوفیانہ کلام پر گہری نظر رکھنے والے فنکار تھے۔"تاجدارِ حرم" وہ بے مثال قوالی ہے جو وجود کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔انسان جذب میں چلا جاتا ہے۔چلیے مان لیا کہ دونوں بھائیوں جیسا قوال دوبارہ پیدا نہیں ہوگا۔مگر ہم نے ان اساتذہ کے شہکار کاموں پر کتنا ظلم کیا ہے۔طنز نہیں کرنا چاہتا۔مگر آج کے دور کے نمایاں گلوکاروں نے اس قوالی کو دوبارہ گایا۔عاطف اسلم اور پاکستان سے ہندوستان منتقل ہونے والے عدنان سمیع دونوں نے طبع آزمائی کی۔مگر اصل کام جو غلام فرید صابری برادران نے کیا تھا، اُس سطح کے قریب تک نہیں پھٹک سکے۔قطعاً یہ عرض نہیں کر رہا کہ یہ دونوں اناڑی گائک ہیں۔اپنی جگہ اور اپنے وقت کے بہت اچھے فنکار۔مگر چند چیزیں جواب کلاسک کا درجہ اختیار کر چکی ہیں انکو اسی بلند سطح پر گانا، اب ممکن نہیں ہے۔کسی کیلیئے بھی نہیں۔ان پر طبع آزمائی کرنا اپنے آپکو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔کوشش کرنی چاہیے کہ اساتذہ جو کام کر گئے ہیں اس پر ہاتھ صاف نہ

کیا جائے۔ "تاجدارِ حرم" قوالی اسی نمایاں سطح کا کام ہے۔ یہ روز روز نہیں ہوسکتا اور ہر کسی سے نہیں ہوسکتا۔

صوفیانہ کلام میں "پٹھانے خان "ایک مستند ترین آواز ہے۔غربت، درد اور مصائب میں گندھا ہوا یہ شخص ہر قیامت سے گزرا۔مشکل بچپن، کسی بھی سرپرست کے بغیر جوان ہونا بے حد مشکل اَمر ہے۔ پٹھانے خان کمال گلوکار تھا۔خواجہ غلام فرید کی کافیاں پورے کرہ اَرض پر اسکی طرح کوئی نہیں گا سکتا۔انسان پر کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ پاٹ دار آواز، سادگی اور لَے میں دوڑتی ہوئی غیر معمولی صوتی اثرات رکھتی ہے۔ پورے خطے میں اس سرائیکی گلوکار نے کمال حاصل کیا ہے۔خیر ہم نے اسکے ساتھ کیا سلوک روا رکھا۔وہ بھی ایک تکلیف دہ واقعہ ہے۔آخری اَیام میں پٹھانے خان کو حد درجہ نظر انداز کیا گیا۔عظیم گلوکار کا خیال تھا کہ وہ اپنی آواز کی بنیاد پر زندگی کے مسائل حل کر لیگا۔مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ تو مارکیٹنگ کا دور ہے۔اس میں خالص سودا تو بکتا ہی نہیں۔ہاں نقل کی بہت اہمیت ہے۔کیونکہ لوگوں کو اصل اور نقل میں فرق کا اندازہ ہی نہیں ہے۔کئی بار تو نقل کرنے والے، اصل گلوکاروں سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ پٹھانے خان کی گائی ہوئی کافیوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ایسے ایسے غیر سنجیدہ لوگوں نے صرف ماڈرن سازوں کا سہارا لیکر پٹھانے خان کے گائے ہوئے کلام کو دوبارہ اتنے ادنیٰ طریقے سے گایا کہ دکھ ہوتا ہے۔سرائیکی زبان کا اپنا ایک مزاج ہے۔لہجہ کی اپنی ایک ساخت ہے۔مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ سرائیکی زبان سے مکمل ناواقف لوگوں نے عظیم گلوکار کے کام کو گانے کی کوشش کی۔نتیجہ جو نکل سکتا ہے وہی ہوا۔کافیوں کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔مگر کسی کو رحم نہیں آیا۔ پٹھانے خان اپنے شعبہ میں لاجواب تھا۔اسکی تو اچھے طریقے سے نقل بھی نہیں کی جاسکتی۔مگر ہم نے اصل کی بجائے نقل سنکر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔شاباش کے ڈونگرے بجنے لگے۔اب جس شخص نے پٹھانے خان کو سنا ہی نہیں، اسے تو یہی لگے گا، کہ یہ اس زمانے کے گلوکار یا گلوکارائیں کی تخلیق ہے۔موسیقی کا یہ زوال بے جان آواز، اچھے کپڑوں اور بہت جدید سازوں سے پورا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔مگر بات بنتی نہیں۔ بنیادی طور پر ہم جعلی معاشرہ ہیں۔ جسے نمبر دو قسم کی چیزیں بے حد مرغوب ہیں۔ہمیں بالکل اندازہ نہیں کہ ہم فنکار کش انسان ہیں۔ ہر شعبہ میں حالات دگرگوں ہیں۔شائد اسلیے کہ ہم اصل سے دور بھاگنے والا ہجوم ہیں!

راؤ منظر حیات